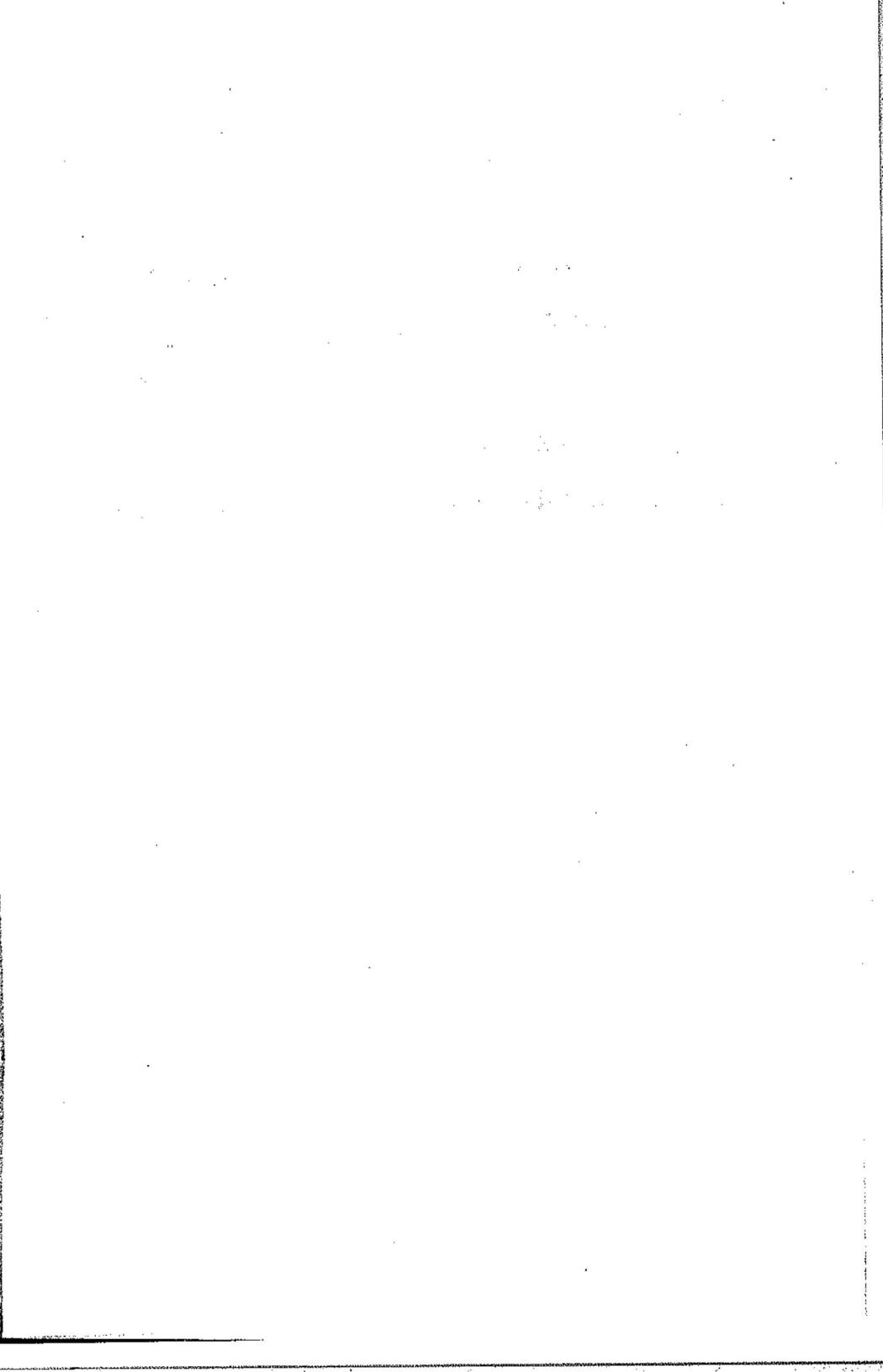


بھوئنا شروع کر دیا ہے۔ میراذ ہن پاکندہ ہونے لگا۔ فقرے بے ربط ہوتے جا رہے ہیں کہ
بانکل اُسی طرح بھوئک رہے ہیں جیسے کل رات بھوئک رہے تھے۔ ان کے لئے کوئی فرق

نمیں پڑتا۔

لکھتے لکھتے وہ اٹھا۔ گھر کی گھول کہ باہر نظر ڈالی۔ سامنے والی دو منزلہ عمارت میں
روشنی ہو رہی تھی۔ سب کروں میں بھلی جل رہی تھی۔ اسے یہ روشنی عجیب لگی۔ وہ تو یہ
دیکھنا پا رہتا تھا کہ آج کی رات تین گھری اور کافی ہے۔

وابس آیا، بستر پہ لیٹتے لیٹتے گھر کی پہ نظر ڈالی، جیران ہوا۔ ابھی صرف دس تھے ہیں؟ اپھا!
اور لگ رہا ہے کہ آدھی رات گزر گئی۔ یا اللہ! یہ رات توجہ کی راتوں سے بھی لمبی ہو گئی۔



خواجہ صاحب ایسی ایسی آکر بیٹھ گئے۔ اب اجان تے سخت کی نے ان کی طرف موڑتے ہوئے پہنچا:

”کچھ پتہ چلا؟“

”مہاں کچھ پتہ چلا تو ہے۔“ آج خواجہ صاحب کے لئے میں ایسید کی رقم ملتی۔

”اچھا! ایک پتہ چلا؟“

”اوہ سر سے ایک شخص آیا ہے کہتا ہے کہ اس نے کرامت کو بنکاک میں فیکھا ہے۔“

”بنکاک میں؟“

”شاہ صاحب! اس میں جیرانی کی کیا بات ہے؟ اس قیامت میں توجس کے جدھر سینگ سملتے ادھر تکل گیا۔ کتنے تو ہندوستان میں پچھے چھپے پھر رہے ہیں کتنے ہندوستان کی راہ نیپال پریچ گئے۔ ادھر مشرق کی سرحد پاک کے کے یہت سے یہ ماہین تکل کئے کوئی رکون گیا، کوئی بنکاک پہنچا۔ وہ شخص بتاتا ہے کہ وہ بنکاک ہوتا ہوا آیا ہے۔ وہاں اس کی مطاقت کرامت سے ہوتی ہے۔“

”کون شخص چے یہ؟“

”ایجی وہ اپنے امتسرا خود دین ہے نا، انہی کا جانتے والا ہے۔ اس سے میں تے اس شخص کا پتہ لیا ہے۔ وہ سیالکوٹ میں ہے۔ تو آج میں سیالکوٹ جا رہا ہوں۔“

”جاؤ اللہ مار کرے گا۔“

”شاد صاحب! آپ کا کیا خیال ہے؟ مجھے تو یقین ہے کہ کرامت زندہ ہے اور وہ پس آئے گا۔“

اباجان نے تامل کیا، پھر بولے:

”اُس کی رحمت سے کچھ دور نہیں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ آدمی کے لئے چاہنسی کا حکم صادر ہو گیا اور پھر وہ پڑھ گیا لیں ایمان پختہ رہنا چاہیے۔“

”شاد صاحب! اللہ کے فضل سے میرا بیان تو بخت پختہ ہے۔ ہاں میں پیروں فیروں کو زیادہ نہیں مانتا تھا۔ مگر ایک فقیر کا میں قائل ہو گیا۔ محمد دین، ہی مجھے اس کے پاس لے گیا تھا اس نے میری صورت دیکھی۔ بولا کہ تو پریشان ہے۔ میں نے کہا کہ پریشان تو ہوں۔ یوں پریشان مت ہو، دعا کر، وہ زندہ ہے مگر مشکل میں ہے۔ پھر مجھے اس نے مجھے ایک دعا تائی۔ روزِ غرب کی نماز کے بعد چالیس دفتر پڑھنے کے لئے شاد صاحب! آپ یقین کریں کہ اسے پڑھتے ہوتے مجھے ایک ہفتہ ہوا ہے کہ سیالکوٹ والے آدمی کی خبر مجھے مل گئی۔“

”اس کے کلام میں بہت تاثیر ہے۔“

”بس جی! میں آج سیالکوٹ جارہا ہوں۔“

وہ خواجہ صاحب کو تکے جا رہا تھا۔ اسے کچھ مہینے کی بات یا دلگھی تھی تاکہ یہ میں بھی خواجہ صاحب ایک صحیح اسی طرح پڑا میدار ہے تھے۔ اُس دفعہ انہیں کہا یہی پہنچتے والے ایک شخص کا پتہ ملا تھا، جس نے اُس آگ سے نکلتے ہوئے یہ راکی سرحد پر کرامت کو دیکھا تھا۔ اور اس شخص کی تلاش میں انہوں نے کہا چکر رکایا تھا۔

”شاد صاحب!“ خواجہ صاحب کچھ سوچتے ہوئے بولے:

”ہوں میں نصیب کا ہوٹا۔ دیکھو مجھ دو بیٹے تھے۔ ایک بڑا گیل، ایک کم گیا۔“

جو سعادت مند تھا، اسے ایک رب ہی لاتے تو وہ آئے جو نالائق تھا وہ بہرے سیئے پر موٹگ دل رہا ہے۔ وہ بذخست سلامت، بہت سے کیا کہتا ہے کہتا ہے

کہ بیٹگا یوں کو آنادی مل گئی۔ میں نے کہا کہ حرام مسے پر انکھل جا میرے گھر سے۔
کھنے گا امریکہ جا رہا ہوں۔ میں نے کہا جاد فعمہ ہو۔»

سلامت کا ذکر نہ کھل کیا تھا اور حسبِ ستور اسے لمبا ہی کھپختا تھا۔ مگر خواجہ صاحب کو جلدی بخیال آگیلہ کہ انہیں سیالکوٹ جانا ہے اور وہ اُنھوں کھڑے ہوئے۔ ان کے نکلتے ہی ای دل ہوئک۔ «اجی ایسے خواجہ صاحب کیا کہہ رہے تھے؟ کہا مرت کا کچھ پتہ چلا؟»
ابا جان نے کسی قدر تأمل کے ساتھ جواب دیا اور کہتے ہیں کہ کوئی شخص اُدھر سے آیا ہے
اُس نے کہا مرت کو بینکاک میں دیکھا ہے۔»
«آگے کیا بتاتا ہے؟»

«اب آگے کی بات کا تو مل کر ہی پتہ چلے گا۔ وہ شخص سیالکوٹ میں ہے۔ آج سیالکوٹ
جا رہے ہیں۔ دیکھو،»
«اجی! وہ غیر آدمی۔ وہ جھوٹ کیوں بولے گا؟ اس نے کہا مرت کو دیکھا ہو گا۔ جب
اُس تے یہ بات کہی ہے۔»

«ہاں! مگر کیا کہا جاسکتا ہے؟» ابا جان چپ ہوتے۔ پھر بولے:
«یہ حال آدمی کو ہر حال ہیں۔ بغیر ہی کی موقع رکھنی چاہئے۔»
«ہاں! ہماری تو دعا یہی ہے کہ بچا راجح طرح بھی ہو وہ اپس آجائے۔ نہیں تو بچا رے
خواجہ صاحب جیتے ہی مر جائیں گے۔» اسی تے کہتے کہتے مھنڈہ اساتس بھرا۔ اسے
کوئی ہمارے دل سے پوچھے۔ ہمارے دل پر کیا گز رہ ہی ہے۔ خواجہ صاحب اپنے
ایک کے لئے اتنے پر لیشان ہیں۔ ہمارے یہاں تو ایک پورا خاندان لاپتہ ہے۔ ارکین،
پھر بولیں:

«اجی! میں نے رات کیا خواب دیکھا کہ جیسے بتوں ہے۔ پختے حالوں، سر میلا
چیکٹ۔ میں اس کے سر پین کنگھی کر رہی ہوں اور کہہ رہی ہوں کہ اسی!

تیر سے سر پیش تو جو تین بھری پڑی ہیں۔“

بیکھتے کہتے وہ چب ہوئیں، پھر اسچل متہ پر رکھ لیا۔ ان کی لگنہ بھرا تی تھی۔

اباجان کا سر چک گیا۔ پھر انہوں نے ٹھنڈا انس بھرا، یو لوے:

«ایم، ہمیں مر جانا چاہیئے۔»

«جی؟» اس نے چونک کران کی طرف دیکھا۔

«ماں بیٹھے! اب ہمیں مر جانا چاہیئے۔ ہست زمانہ دیکھ لیا۔ جو نہ دیکھتا تھا۔ وہ بھی دیکھ لیا۔ آگے دیکھنے کی تایب نہیں ہے۔»

«حالات بہتر ہو رہے ہیں۔ آگے اور بہتر ہو جائیں گے۔»

«گھر کئے دن کے لئے؟، اباجان رکے، پھر لوے:

«بیٹھے حالات کے بہتر ہوتے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اجمال بہتر ہونے چاہیں۔»

انی نے جیسے کچھ نہیں سنا۔ ان کا دماغ کہیں اور کام کر رہا تھا اس سے بیٹھا تو انہیں وز کیا بتا رہا تھا کہ صابرہ نے ریڈ یو میں نوکری کر لی ہے۔

«صابرہ نے بھی مجھے پتہ نہیں، سرپندر نے لکھا تھا۔، صابرہ کے اچانک ذکر پر وہ

کچھ سپشاگیا تھا۔

«تو بیٹا اس سے، ہی خط لکھ۔»

«خط اصلیہ کو؟، اس کی سمجھیں کچھ نہ آیا کہ امی کیا کہہ رہی ہیں؟

«اس سے اتنا ہے کہ جن کے عزیز درشتہ دار پندوستان میں ہیں، وہ لپ چھپ کے

ان کے پاس پہنچنے لگے ہیں۔»

«کیسی پابیں کہتی ہو ذکر کی ماں!، اباجان نے خود یہ بھی سے کہا۔

«اسے ہے مجھے کیا خبر؟ میں نے تو سنا ہے۔»

«جلیسی تم سننے والی ہو، ویسے ہی سننے والے ہیں۔»

” اے ہے آنکھ راجا کے وہ کہیں تو جائیں گے۔ جب آدمی پر زمین تنگ ہوتی ہے تو وہ تو پس نکل کھڑا ہوتا ہے۔ یہ تھوڑا ہی دیکھتا ہے کہ کہاں جا رہا ہے؟“

” مگر وہ زمین تو اس پر پہنچا ہے تاگ ہو چکی تھی۔“

” ہاں پہنچا وہ زمین تنگ ہوتی تھی، اب یہ زمین تنگ ہو گئی۔“

ایا جان یہ سن کہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر لوٹے:

” اللہ تعالیٰ لاتے زمین کو کشاور یا تھا مگر آدمیوں کے ہاتھوں وہ تنگ ہوتی چلی جا رہی ہے۔“

” نیز پیش تو یہ کہہ رہی تھی۔“ اسی پھر اپنے مضمون پر واپس آئیں ” کہ صابرہ کو کچھ تو خیر ہو گی اسے ہم تو بالکل بے نیز بھیجیں ہیں۔ ہم سے زیادہ توہنڈ وستان میں لوگوں کو خیر ہے تو صابرہ کو ذرا اخاطر تو لکھ۔“

صابرہ کو خط لکھوں؟ اب اتنے زمانے کے بعد؟ وہ پس و پیش میں پڑ گیا۔ مگر اسے جلد ہی خیال آیا کہ میں خط لکھ کیسے سکتا ہوں؟ ” امی اہنڈ وستان کے ساتھ ڈاک تو پند ہے۔ خط لکھا کیسے جا سکتا ہے؟“

” اے ہاں مجھے یہ تو خیال ہی نہیں رہا تھا۔“ رکین - پھر لوٹیں۔

” اسے بیٹا! خط لکھنے والے لکھ ہی رہے ہیں سکتے ہیں کہ نندن والوں کے ذریعے ہند وستان سے خط و تابت ہو رہی ہے۔ اے بیٹا! نندن میں تیرا کوئی دوست نہیں ہے؟ خط اُسے بھیج دے۔ وہ وہاں سے ہندوستان بھیج دے گا۔“

وہ پھر نیز و پیش میں پڑ گیا۔

”یارا میں خط لکھنا پاہتا ہوں۔“

”کسے؟“

”صلیمہ کو۔“

”صلابیدہ کو؟ عرقان نے خور سے اُسے دیکھا۔

”ہاں صابرہ کو۔“

”اب عمر گز اتنے کے بعد؟“

”یارا ای کے دماغ میں یہ بات اُگتی ہے کہ ہندوستان میں صلیمہ کو غالباً بی کا اتا پتا ہونا چاہیتے۔ تو اب وہ تقاضا کر رہی ہیں کہ صابرہ کو خط لکھو۔“

”اور یہ تقاضا تمہاری خواہش کے عین مطابق ہے۔“ عرقان مسکرا یا۔

میری خواہش کے مطابق؟ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میری اب کیا خواہش ہے؟ اب جیسے کہ اتنا بارہنگز رچکا ہے اور اتنا فاصلہ پیدا ہو چکا ہے میرے اور اُس کے درمیان زمانہ اور زمین دنوں حائل ہو گئے ہیں۔ دونوں چمارے خلاف اکٹھے ہو گئے ہیں۔ کتنا زمانہ ہو گیا جب تک ہم ایک ہی زمین پر چلتے پھرتے تھے۔ ہمارے دنوں کے سروں پر ایک ہی آسمان پھیلا ہوا تھا۔

دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔ دن، جیسے، سال۔ لگتا تھا کہ واپسی کے دروازے ہمیشہ کئے نہ ہند ہو چکے ہیں۔ گم ہو جاتے والے سدا مکرم رہیں گے۔ یزج یزج میں بس کوتی اچانک آنکھتا اور لوگ ہیران ہو کر استدیکھتے کہ اچھا وہاں سے کوتی نجح کر بھی نکل سکتا ہے؟ پھر لوپھتے کہ وہاں سے کیسے نکلے اور یہاں تک کیسے پہنچے؟ اور وہ سنا تاکہ کس طرح تین دن تک وہ ایک جلے چنکے گھر میں بلے کے اندر بیوکا پیاسا سادھے پیٹھا رہا پھر کیسے

چھپتا چھپتا سرحد پار کر کے کلکتہ پہنچا۔ لیں صاحب! وہاں سے میں ہاؤڑہ میل میں بلیٹھ لیا۔ خیال تھا کہ علی گڑھ جب آتے گا تو پیٹ فارم پر کوئی نہ کوئی پر اتنا آشتہاں ہی جائے گا۔ میں کسی کو پہچان لوں گا یا کوئی مجھے پہچان لے گا۔ یا را جب علی گڑھ آیا تو چائے کے ٹال کے بالکل سامنے میراڑبہ رکا اور وہی اپنا خان و مہن بیٹھا ہوا تھا۔“

”تم وہاں اُتر گئے؟“

”نہیں یا را کہاں اُترتا ہیں میں ڈر گیا کہ کوئی مجھے پہچان نہ۔ دم سادھنے چھپاتے پیٹھا رہا۔ جب گاڑی چلی اور سٹیشن سے نکل گئی اور علی گڑھ آنکھوں سے اوچھل ہو گیا، پھر جان میں جان آئی۔ لیں صاحب! پھر میں نے دلی ہی میں جاسکے دم لیا۔ گاڑی سے اُتر کر سیدھا جامع مسجد لیں جب میں وہاں پہنچا ہوں تو بالکل پھاٹک تھا میں نے کہا کہ پیارے اب تو کسی نہ کسی سے کہتا ہی پڑھ کا مسجد میں کہی کے قریب گیا۔ مگر پھر رک گیا۔ آخر ایک پڑھے میان نظر کرتے صورت سے بہت دردمندا و شفیق نظر آتے تھے لیں میں ان کے قریب جا بیٹھا۔ پنکھ سے انہیں بتایا کہ کہاں سے آ رہے ہوں اور لیں روپڑا۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور لگھ لے گئے۔ میں نے سوچا کہ ایک رات ان کے کھر رہوں گا اور کہیے کے اگلے دن صبح کو پبل پیڈ ول گا۔ مگر یا را پھر نیت بگڑ گئی۔“

”وہ کیوں؟ کہیں سننکھ لے گئی؟“

”نہیں یا را اصل میں اُن دنوں وہاں دیا کیزہ، چل رہی تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ کہ پیارے! دلی آتے ہو تو مینا کماری کو دیکھ کے چلو۔ تو میں ایک دن دیا کیزہ، دیکھنے کے لئے رک گیا۔“

”کیسی فلم ہے؟“

”ایک دم سے فرست کلاس۔“

”وہ لیں ایک ہی فلم دیکھی؟“

”دلی میں جلتے دن رہا اور کیا کیا، فلمیں ہی دیکھیں۔ آخر بڑے میان نے کہا کہ صاحبزادے!
پولیس کو کہیں سن گئیں مل گئی تو ہمارے غریب خانے پہ دوڑ آجائے گی۔ تم پکڑتے جاؤ گے
اور ساتھیں ہم ہی کچھ کچھ پھر میں کے یہاں سلبے بنو۔ میں اسلئے ہی
دن فرنیز پین بلیڈ سیدھا امر تسری تکڑیم لڑا لڑو کے سرحد پار کی اور پاکستان میں ۔۔۔
سوکوئی ہندوستان کی راہ بستی خاک چھانتا، چھپتا چھپتا پہنچا۔ کسی نے اس
قریب بلاسے نکل نیپال کی راہ لی اور وہاں سے یہاں آئے کا ڈول ڈالا۔ کوئی یہ مایں نکل گیا
اور وہاں سے مصائب و آلام جھینٹانا والیں ہوا۔ یہ مت سے ہندوستان میں رجی اسیری کلیخ
کروالیں ہوتے ہیں پھرتا نالا گیا۔ ابیرا اور گشادگان والیں آتے چلے گئے لگتا تھا کہ سب
ہی والیں آگئے یا شاید جیسے نہ کوئی گیا، نہ کم ہوا، نہ کم ہوا۔ زخم لکھنی جلدی مندل ہو
جاتے ہیں اور کھا پچھے لکھنی سرعت سے بھر جاتے ہیں۔ شریں چلتے پھرتے کون سوچ سکتا تھا
کہ یہاں سے کچھ لوگ چلے گئے ہیں کہ والیں نہیں آتے اور کچھ ڈیورڈ ہیاں ہیں کہ ہنوز والیں
آئے والوں کا رستہ دیکھ رہی ہیں۔ خواجہ صاحب ہنوز آس ویاس کے وہند کی میں بھلک
رہے تھے۔ وہ اب بھی روندہ ایجاداں سے ملنے آتے۔ ایک دوسرے سے وہی ایک ہوال
کہ کچھ پتہ چلا؟ جیسے یہ سوال ازل سے ہو رہا ہے اور ایکتا ہوتا رہے گا۔

”شاہ صاحب! آپ کے عذیز دوں کا کچھ پتہ چلا؟“

”نہیں بھاتی۔“

”آئے والوں میں سے کسی نے کچھ نہیں بتایا؟“

”نہیں بھاتی۔“

”کسی طرف سے کوئی خط؟“

”نہیں بھاتی۔“

”تعجب ہے! اتنے لوگ آتے ہیں کسی نے کچھ نہیں بتایا!“

”تمہارے بیٹے کا کچھ پتہ چلا؟“

”ہاں جی، شاہ صاحب! آپ کی دعا سے کچھ پتہ چلا تو ہے۔“

”کیا پتہ چلا؟“

”شاہ صاحب! میں نے مولانا شناہ اللہ سے فال تسلیم کیا تھی۔ بہت اچھی فال نکلتے ہیں۔ فال میں نکلا ہے کہ کہاً مرت پیریت سے ہے، فال پس آئے کا اور جی بخوبی بھی یہی کہتا ہے۔ بخوبی نو دن ہے نامیں اس کے پاس گیا تھا۔ اس نے باقاعدہ زانچہ بنائے ہے دکھایا کہ خواجہ جی! اپنی آنکھ سے دیکھ لو۔ اس وقت تمہارے بیٹے کا متدارہ خاتمہ زحل میں ہے۔ یہیں نکلتے والا ہے۔ لیس دیکھتے رہ جاؤ گے کسی روز اچانک سے آجائے گا۔“

”اللہ بہت سب سب انساں ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“

”مجھے تو یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ ویسے آج میں لائل پور جا رہا ہوں۔“

”وہ کیوں؟“

”ایجی وہاں میرے سائز ڈکا پڑا ہے۔ اس کا جفا فی ادھر سے نکل کے آیا ہے۔ میرے سائز ڈونے بتایا کہ وہ کہاً مرت سے ملا ہے۔ یہکہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ کہاً مرت نے اسے کوئی چھٹی بھی دی ہے۔ تو آج میں لائل پور جا رہا ہوں۔ دیکھتا ہوں جبھی میں کیا لکھا ہے؟“ اُنھوں کھڑے ہوتے۔

خواجہ صاحب اور امی داخل ہوتیں:

”ایجی! میں نے کہا کہ یہ خواجہ صاحب فال کی جویات کر رہے ہی تھے تو مجھے خیال آیا کہ ہم بھی کیوں نہ فال تسلیم کیں۔“

”ذالکہ کی ماں! اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا تب کچھ ہوگا۔ لبس اُس پر بھروسہ رکھو۔“

”پتہ نہیں اُس کا حکم کیس ہوگا؟“ امی نے بڑھی سے کہا۔

”اس کی صلحت وہی جلتے۔ ہم تو خود اس کے حکم کے منتظر رہیے ہیں۔ حکم ملے تو

کوچ کریں۔“ رکے، ٹھنڈا ساں بھرا، ”بس اب ہمیں مر جانا چاہیئے۔“

”لے ہے تم کیا ہر وقت مر نے کی رست لگاتے رکھتے ہو۔ یہ نیا سودا سوار ہوا ہے؟“

”ذاکر کی ماں! جناب امیر کا قول یاد کرنے کہ تم اور تمہاری آزادیوں اس دنیا میں جہاں ہیں ذاکر کی ماں! انہماں لوں کو یاد کرتے رہتا چاہیئے کہ انہیں یہاں پہنچنے نہیں رہنا۔“

”ای نے یہ راہی سے ایجاد کی بات سنی اور اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔“ اسے ذاکر کا حلقہ سے خط کا جواب نہیں آیا؟“

”ای آئے گا۔ ڈاک و ہاں دیس سے پہنچتی ہے اور دیس ہی سے وہاں سے آتی ہے۔“

”اسے بیٹھے! آخر کتنے دنوں میں خط پہنچتا ہے اور آتا ہے! تجھے تو لکھے ہوتے خاصے دن ہو گئے۔“

”ای ہندوستان پاکستان کی ڈاک میں بہت گٹبری ہے۔ کوئی خط پہنچتا ہے کوئی نہیں پہنچتا۔“

”اسے پڑھا تو اپنے دوست کو دوسرا خط لکھو۔“

”لکھا ہے! ای، میرا خیال ہے اس خط کا جواب چلدی آئے گا۔“

”بیار میں دو خط لکھ چکا ہوں۔ میر نہیں نے جواب نہیں دیا۔ پہتہ نہیں کیا بات ہے؟“

”پھر اسے بلا و راست خط لکھو۔“

”اُسے؟“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”شیراز کا دروازہ کھلا اور افضل داخل ہوا۔“ بیار میں نے ناہی کہ وہ چوما بھی آگیا۔

”کیون؟“

”زوار۔“

”تم نے اب ستاہی ہو اؤسے آئے ہوئے۔ پوشنگ بھی ہوتی اور ترقی کے

ساتھ، عرفان کے لبھیں عکوڑا لٹز رکھا۔

”یار! تو اُس سے معاف کر دے۔ وہ ہم میں سب سے زیادہ قابلِ رحم آدمی ہے۔“

”قابلِ رحم؟“ عرفان نے افضل کو ختم کیں تظہروں سے دیکھا۔

”ہاں یار! اب مجھے اُس پر بہت ترس آتا ہے۔ وہ رحم کا مستحق ہے۔“

”کس وجہ سے؟“

”اس وجہ سے کہ وہ سی۔ ایس پی ہو گیا ہے اور بتقیٰ کرتا چلا جا رہا ہے۔“

”واقعی وہ بہت قابلِ رحم ہے۔“ عرفان نے تلخ نجیب میں کہا۔

”یار! تم مجھے شراب نہیں پلا سکتے؟ بہت پیاسا ہوں۔“

”ہم صرف چائے پلا سکتے ہیں۔“

”چائے؟ چائے تو بیکار پیزیر ہے۔ باطن کی غلافت شراب سے دھلتی ہے۔“ یہ کہتے کہتے اس نے جیب سے لونٹ نکالے گئے۔ ”یار! صرف دس روپے کی سر ہے عرفان! پانچ تو نکال۔“ اس کی طرف دیکھتے ہوتے بولا:

”پانچ اپنا کامادے گا۔“

اس نے اور عرفان نے پانچ پانچ کا نوٹ جیب سے نکال کر افضل کے حوالے کیا۔

افضل فوراً انھیں کھڑا ہوا سنگر پھرا سے کچھ یاد آیا۔ بلیخیتے ہوتے بولا۔

”یار! اودھ ووچھے ہو جایا کہتے تھے، میں ان کے لئے دعا

کرنا چاہتا ہوں۔“

”کہ وہ امر کیہا ہی میں رہیں۔“

”وہ نہیں یار! اچھے سے یادِ عامت کراؤ۔ سلامت اور احیل اتنے بُرے نہیں تھے۔ شراب پی کردا پچھی باتیں کرتے تھے۔ یار! اودھ امر کیہ کیوں چلے گئے؟ میں ان کے لئے یہاں بندوبست کر رہا تھا۔ مجھے مریعے پس الٹ ہوتے والے ہیں۔ ایک مریعے میں تو صرف کلابیک تختے

ہوں گے۔ ایک مرد میں میں چاہتا ہوں کہ میں بیرہوٹیاں ہوں۔»

«بیرہوٹیاں؟» عرفان نے نظریں نظریوں سے اُسے دیکھا۔

«کاکے! تو چپ رہ سمجھے یہ بات سمجھنیں آتے گی۔ سافن میں میں بہت پریشان پھرتا ہوں۔ یہاں کہیں بیرہوٹی دکھائی نہیں دہتی۔ بیرہوٹیاں ہونی چاہیں۔ پاکستان کو خوبصورت بنانا ہے۔» پھر ایجہ پسل کر مخاطب ہوا:

«سو! تم دونوں میرے ساتھ رہو گے یہ میرا حکم ہے میں اور تم دونوں۔»
«اور بیرہوٹیاں۔» عرفان نے لکھا رکھا۔

«ہاں اور بیرہوٹیاں۔ خوبصورت پاکستان میں صرف خوبصورت لوگ رہیں گے۔»

اس نے گھر سے لفڑی اور برستی انٹیوں میں سرکوں کو جبور کیا اور «شیراز» کے بند پر دہ پوش دروازے پر دشک دی۔ ایک دشک، دوسرا دشک، تیسرا دشک بعد نے تھوڑا سا پردہ سر کا کمان درجھان لکا، پھر دروازے کا ایک پٹ خدا سا گھولا «ڈاک بھی، جلدی آ جاؤ۔» اندر نیم تاریکی میں خالی نیز کر سیوں کا جائزہ لیتے ہوتے اس نے اس گوئے کوتا لاجھاں عرفان اکیلا بیٹھا چلتے پی رہا تھا۔
 « یار، یہ تو وہی زمانہ آ گیا۔»

« اس سے یہ زمانہ، اس نے کہ جب وہی زمانہ والپس آتا ہے تو زیادہ براہو کرنا ہے مگر تم کیسے اگئے یہ مجھے تو یقین نہیں تھا کہ آج تم آ سکو گے۔»
 « یہ آگیا۔ دلی کے وضعداروں میں ایک وضعدار بیز رگ تھے۔ روز نشام مقررہ وقت پر دوست کے گھر دشک دیا کرتے تھے اور ہمیشہ کر رہے تھے۔ غدر جب پڑا تو آنے جاتے کے سارے رہتے بند ہو گئے۔ وہ وضعدار گھر سے نکلے اور کھائیوں، تالیوں میں سے رینگ رینگ کر لشتم پیشتم مقررہ وقت پر دوست کے گھر ہنچے۔»
 « ہاں ہم ہمی غدر کے وضعداروں میں سے ہیں۔»

« اگرچہ وہ وقت ابھی نہیں آیا ہے۔»

« ہاں ابھی تو نہیں آیا ہے۔»

دروانے سے پس پھر دشک ہوئی اور پھر عبدالنے دو ملکہ تھوڑا سا پابند سر کا کمر شیشے سے جانکا۔ پھر سپلے کی طرح ایک پٹ فنا سا کھولا «افضال بھی، جلدی کرو۔» افضال کو داخل کرنے کے بعد پھر دروانہ پند کر لیا۔

یہ تم تاریک فضایں غالی میز کر سیبوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس میز پر زکا بیس مرکوز کیس جہاں وہ دونوں بدیٹھے تھے «اے لوگو! اتم دیکھتے ہو کہ فساد کی صورتیں پھر نہ وار ہوئے ہیں۔»

«ہاں ہم نے سنا اور ہم نے دیکھا اور ہم نے تصدیق کی۔» عرفان نے ایک ہلکے سے طنزیہ لپچ میں کہا۔

افضال نے خوش ہو کر اس کی پیٹھ پھیکی «تو اچھا آدمی ہے بس جب تو مجھ سے انکار کرتا ہے اس وقت کہ وہ ہو جاتا ہے۔»

« یا ر، کیا پھر کچھ ہوتے والا ہے؟» اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

« ہاں سلامت آگیا ہے،» عرفان نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے اطلاع دی۔

« کیا کہا؟ وہ چوبلے پھر آگیا؟» افضال بخوبی کہا «اور دوسرا چوبلے؟»

« دونوں آگئے ہیں اور مسلمان ہو گئے ہیں۔»

« بالکل، دونوں القلابی دو ٹپو ٹپی سر پر منڈھ کر مسجد میں نماز پڑھنے یا تے ہیں۔»

« واقعی؟» وہ سیرت زدہ رہ گیا «یر واقعی تشویشناک بات ہے،»

عبدل نے چلتے لاکر رکھی، پھر کھڑا ہو گیا «یہ جی سب کیا ہو رہا ہے؟»

« ہوم دیکھ رہے ہو۔» عرفان بولا۔

« یہ جی اچانک ہی شروع ہو گیا۔ سان گمان بھی نہیں تھا کہ پھر ایسا ہو گا۔»

« عبدل!» افضال نے اسے گھوڑے کے دیکھا « تو بھی چوبلے ہو گیا۔»

عبدل نے افضال سے سیدھا سوال کر لیا « افضال صاحب جی! آپ بتائیں؟ آفر

ہو گا کیا؟ کیا ہوتے والا ہے؟“

فضل نے ہونٹوں پر اٹکلی رکھی ”عبدل چپ رہ جسے بیان کرنے کا حکم نہیں ہے۔“

فائزہ بیگنیڈ کی دور سے آواز آئی۔

”کہیں اگ لگی ہے۔“

خاموشی۔ سبکے کام فائزہ بیگنیڈ کی آواز پر تھے۔

”دوستو! میں تم سے ایک اجازت لینا پاہتا ہوں۔“ فضل نے اتنی سیندھی سے

کہا کہ وہ عرفان اور عبدل ٹینوں گوش برآواز ہو گئے۔

”یادت ہے ہو کہ یا فرید نے کلر والے خواجہ سے کیا فرمایا تھا؟ نہیں جانتے ہو تو سنو۔ خواجہ

نے ہا یا کو شہر کے کہہ وہ لوگوں کا حال لکھ کر بیچا۔ یا بائے کہلا بیچا کہ صابر کلبر تیری بکری ہے

ہم نے اجازت دی۔ چاہے تو اس کا دودھی، چاہے اس کا گوشت کھا۔ تب خواجہ نے مسجد

کے سامنے کھڑے ہو کے کہا کہ اسے مسجد سیدہ کہہ مسجد حکم بجا لاتی اور ایسا مسجد ہ کیا کہ سینکڑوں

بلیں کی نیچے دیکے مر گئے۔ پھر دیا پھیلی۔ ایک ایک گھر سے ایک ایک وقت کی کمی

چاہزے نکلے۔“

فضل سنا کر چپ ہو گیا۔ پھر ٹینوں چھروں کو گھوڑے کے دیکھا۔ پھر بھیر لیجیں یو لا۔

”دوستو کیا کہتے ہو؟ اس یکری کا کیا کروں؟ دودھ سیوں یا گوشت کھاؤ؟“

عرفان نے افضل کی لپری تقریر کو نظر انداز کیا اور اس سے مخاطب ہوا ”ذا کہ اب

تمہارے والد کا کیا حال ہے؟“

”کوئی بات نہیں، بڑھلپے میں آدمی انسی ہی باقیں کرتا ہے۔“

شجرہ بالو سیدہ مخطوطے، دیک لگی پیلے ورقوں والی کنائیں، پہلو نے رقصے پر پڑے، کب

کیک کے لکھے ہر سے نسخے، دعائیں، تعویزیں، ایا جان عینک رکھائے ایک ایک تحریر کو غور سے

پڑھتے جاتے تھے اور اس کے سپرد کرتے جاتے تھے۔

« اے ہے آج یہ تم کیا دفتر کھول کے بیٹھ گئے ہو۔ فرطیعت تو صیصل جلتے دی ہوتی یہ
سچھ لوکہ بڑھا پے میں آدمی ایک وقوع گہ جاتے تو مشکل سے کھرا ہو گئے ہے،»

و ذاکر کی ماں ادا من چھاڑ رہا ہوں۔ آدمی جب اُٹھے تو ادا من چھاڑ کے اُٹھے کارک کریو لے
« اللہ کا شکر ہے کہ دامن زیادہ گرداؤ نہیں۔ دھا بیدار، نہ روپیں پسیں۔ اگر تھا تو ادھر ہی یہیں
یس یہی تھوڑے اوراق پارینہ ہیں۔»

« ابی تمہیں تو وہم ہو گیا ہے۔ ہر وقت مرنے کا ذکر اچھا نہیں ہوتا۔»

« ذاکر کی ماں! اب اچھا ذکر کوں سا کریتے کے لئے رہ گیا ہے۔ ویکھ نہیں رہی ہو پا کتنا
یہیں کیا ہو رہا ہے۔» یہ کھتکتے انہوں نے ایک پھونڈی لگی جلد کی کتاب اُٹھانی تھوڑ کہ
دیکھا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا یہ حضرت سجاد کی دعاویں کا مجموعہ ہے۔ اختیاط سے
رکھو۔ رکے کچھ سوچا، پھر کہنے لگے « ایک سوال کرنے والے نے سوال کیا کہ یا سید الساجدین،
آپ نے صحیح عالم میں کی؟ آپ نے فرمایا پالنے والے کی قسم، ہم نے بنی امیہ کے خلم میں
صحیح کی۔» اب اجانب یہ کہ کے افسر دہو گئے، کہنے لگے میٹے ابی سے اب تک وہی صحیح پل
رہی ہے، چیپ ہو گئے، پھر بولے « اور طوز نک پھلے گی۔» پھر چیپ ہو گئے اور لمبہ بھر
بعد خود ہی کہنے لگے « جب ہی تو حضرت رابعہ صریٰ تے ایسا چوڑا دیا تھا کسی نے پوچھا
کہ آپ نے دینا میں اکہ کیا کیا؟ فرمایا، افسوس! اہاں اس نیک بی بی نے تو افسوس کرنے
کا حق ادا کیا کہ ہر وقت کہ یہ کہتی تھیں، ہم نے کہا حق ادا کیا۔ یہ چند ہنڑی آہیں
بھریں اور چیپ ہو رہے شایدہ ہمارے حصے میں اتنا ہی افسوس آیا تھا۔ آگے جو زندہ
رہے گا وہ اپنا حق ادا کرے گا۔» مختلط انسان بھرا اور پھر کاغذات کہ بیٹھنے لگے یہ لو، یہ
درد قولیخ لاتستہ ہے، حکم ناہین کا لکھا ہوا۔ ایک پڑیا تمہارے سوانح کشنوں پہ بھاری
ہے۔ اختیاط سے رکھو، اور وہ خست حال پر بھی اسے دے کہ پھر چڑیں الٹ پلٹ کرنے لگے۔
لپچے کے اندر کے خلنسے ایک سجدہ گما، ایک تسبیح نکلی « ذاکر کی ماں، یہ تم رکھ لو۔

مسجدہ گاہ خاکِ شفا کی ہے اور تسبیح خاک کرہ بلا کی ہے۔ دونوں چیزوں کو سانکھوں سے لگایا،
لوسر دیا اور امی جان کے حوالے کر دیا۔

پنچ کے کہیں بہت اندر سے کاغذوں کے نیچے سے چاپیوں کا ایک گچہ اپناد کیا اسے خوب سے
دیکھا۔ بولے ”تم اس روز جو میں کی چاپیوں کو یاد کر رہی تھیں، یہ میں گیتن“،
امی کا مر جایا پھر کھل اٹھا ”پسح؟“ چاپیوں کے گچے کو اشتیاق بھری نظر وں سے دیکھا
”اجی تمہیں یقین نہیں آؤ سے کا، اس روز جب تم نے کہا کہ جنہیں کہاں رکھی ہیں تو میرا دل
دھک سے رہ گیا لگتا تھا کہ جسیسے جسم سے روح نکل گئی ہو۔“ رک کر بولیں ”اجی زندگ تو نہیں
لکھا ہے۔“

ایا جان تے ایک مرتبہ پھر چاپیوں کا جائزہ لیا ”نہیں“، ہم نے تو انہیں زندگ لگنے
نہیں دیا، آگے ذاکر میاں جانیں پھر اس سے غلطی ہوتے ہیں اس طرف کی چاپیاں میں
جس پر اب ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ اور حق پہلے بھی کہاں تھا۔ دنیا ہمیسا کہ جزاں امیر نے
فرمایا۔ ہم ان قاتھے ہے سہم اور ہماری آرزویں اس میں ہمان میں۔ ہمماں لوں کا حق نہیں ہوا کرتا۔
نہیں تینا ہمماں لوں کو نواز دے اس کا احسان ہے اور نہیں کے ہم یہ یہت احسانات میں
یہ چاپیاں امامت میں۔ اس امامت کی خناقت کرتا اور پھوڑی ہوتی نہیں کے احسانوں کو
یاد رکھنا کہ یہی تھاری سب سے بڑی سعادت مند ہو گی، ”یہ کہتے کہتے ایک دم سے سالن
اکھر گیدا ذیت کی کیفیت کے ساتھ انگھیں بند کیں اور سینے پہ مانکر کھا۔ ای گھیر الہ فوراً
کھڑتی ہو گئیں اسے یہ کیا ہو گیا۔“ سہارا دے کر لٹایا۔ بیٹھے ڈاکٹر کو بلا قدر، ایا جان تے
انگھیں کھولیں۔ اشارے سے منع کیا۔ آہستہ سے بصد و وقت کہا۔ سخنایا امیر تشریف لائے ہیں ॥
وہ جیسے سکتے میں آگیا ہو، بہت بنا دیکھتا رہا۔ ایا جان تے ایک مرتبہ پھر انگھیں کھولیں،
اس کی طرف دیکھا، آہستہ سے جیسے سرگوششی میں کہہ رہے ہوں ہیٹھے صبح ہو رہی ہے مروود
پر بڑھو۔ ساتھ ہی ہیچکی لی کہ ستر کیسے یہ ڈھلنک گیدا امی کہاں اتنی گھبرائی ہوئی تھیں، کہاں

ایک دم سے ساکت ہو گئیں۔ پھر انہوں نے بہت آہستہ سے چادر سے اس ٹھنڈے جسم کو
ڈھانپا۔ ساتھ ہی زمین پر ڈھیر ہو گئیں اور پتی پر سرٹکا نکے سسکھاں لینے لگیں۔
کام کے اتیرا بابا طبیب آدمی تھا۔ افضل نے اسے گلے رکھا تھا ہوتے جذباتی لمحے
میں کہا، «میں اسے دیکھتا تو سوچتا کہ پنگھوڑے میں لیٹھ لیتے اس کی ڈاٹھی مکل آئی ہے۔
بالکل بچھے تھا، ایک دم سے معصوم۔»

«واقعی بہت نیک اور شریف آدمی تھے۔» عرفان جودی سے چپ بیٹھا تھا، متاثر
سے بولا۔

افضل نے عرفان کو عنور سے دیکھا، «شکر ہے تو نے میری تائید کی۔ فتنی میں کم از کم
ایک آدمی کے بارے میں تو تیری راستے ایچھی ہے۔»
پھر خاموشی پھاگتی۔ پھر افضل کچھ سوچتے ہوئے بولا، «ذاکرہ میری نافی حقی ناوجہ
سے آئی حقی ہی کہ رہی حقی کہ کامباڑھ اُتھ گئی، ہو گئی، مگر ہل۔»
«ہاں ہاں، کیا ہوا انہیں؟»
«وہ مر گئی۔»

«اچھا؟— بہت افسوس ہوا۔— مگر کیسے؟»
«یس جیسے تیرا باب مگریا۔ اس میں کیسے اور کیوں نہیں ہوتا۔ اس آدمی سر جاتا ہے؟»
«میں کہتے ہو۔»

«ایک دن بہت لجاجت سے اس تے مجھ سے کہا کہ کا کا، اتنا ویلہ ہو گیا۔ ای تو باڑھ
اُتھ گئی ہو گئی۔ مجھے تو گھر لے چلی، میں نے کہا کہ میری نافی باڑھ اُتھ گئی مگر اس طرف
چڑھ گئی ہے۔ اس تے مجھے پہنچی پہنچی انہوں سے دیکھا اس ایک لفظ کہا، «اچھا، اور مر گئی۔»